© rasailojaraid.com

• مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی مرحوم

امیرِ شریعت سید عطاءاللہ شاہ بخاری کے علمی امتیازات

زیر نظر مضمون مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی مرحوم کی یادگار تحریر ہے۔ جس میں انہوں نے حضرت امیرِ شریعت کی زندگی کے نہایت اہم گوشوں پر اظہار خیال کیا ہے۔
اگست ۱۹۹۶ء میں امیرِ شریعت کو ہم سے رخصت ہوئے پینتیس برس ہو رہے ہیں۔ انہی کی یاد میں ذیل کی تحریر ہدیۂ قارئین ہے (ادارہ)

اہلِ نظر کا کہنا ہے کہ متحدہ ہندوستان کے دورِ زوال میں ہر شعبۂ زندگی میں بڑے بڑے باکمال لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لے کر برطانوی سلطنت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ایک شعبہ خطابت کا بھی تھا جو ابلاغ کے لئے ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ابلاغ کے لئے بہت حد تک آج میڈیا سے کام لیا جا رہا ہے پھر بھی خطابت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور جس دور کے حوالہ سے ہم بات کر رہے ہیں۔ اس میں تو خطابت ہی خطابت تھی، ملت مسلمہ کی اس دور کی تاریخ میں ابوالکلام، سید سلیمان ندوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، نواب بہادر یار جنگ کے پہلو بہ پہلو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام اس شعبہ میں بڑا نمایاں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ شاہ جی بہت سے حوالوں سے ایک ممتاز شخصیت کے مالک ہوں۔ ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہر خطہ و علاقہ کی زبان میں اس خطہ و علاقہ کے محاوروں کا لحاظ کر کے اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک اس کا پیغام پہنچانا اور ہر زبان کے لاتعداد اشعار اور ضرب المثال کو موتیوں کی طرح جڑنا شاہ جی کا ہی کام تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ابوالکلام، سید سلیمان، علامہ عثمانی، مولانا جوہر اور نواب بہادر یار جنگ سبھی شاہ جی کی خطیبانہ عظمت کے معترف تھے۔ ان کی خطابت کو موہبت الٰہی قرار دیتے اور برملا یہ کہتے کہ ان کی خطابت کے مقابلہ میں ہماری خطابت ایسے ہی ہے جیسے قورمہ کے مقابلہ میں چٹنی۔ لیکن میں آج کی صحبت میں شاہ جی کی علمی حیثیت کے حوالہ سے بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ خطابت کی دنیا میں بہت سے نام ایسے بھی مل جائیں گے جہاں لمبا چوڑا علم نہیں ہوگا اور اب تو گستاخی معاف خطابت نام ہی جہالت کا بن گیا ہے۔ آج بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں خطابت کے ساتھ علم کی دولت میسر آئی ہے۔ اکثر نامور خطبا ایسے ہیں جن کا مبلغ علم چند قصص کی کتابیں ہیں اور بس۔ اس لئے آج کے دور میں کسی کی خطیبانہ عظمت کے ذکر کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بے چارا علم سے کورا تھا۔ شاہ جی کی علمی عظمت کا کھلے بندوں اظہار و اعتراف ایشیا کی سب سے بڑی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب مرحوم نے خوب اظہار کیا اور قاری محمد طیب صاحب نے کہا کہ قرآن مجید کی الہامی تفسیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں شاہ جی کو کمال حاصل ہے بلکہ قاری صاحب کی خواہش تھی کہ جن اسرار و رموز قرآنی کا تذکرہ شاہ جی تقریروں اور نجی مجالس میں کرتے ہیں۔ اے کاش یہ صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جائیں۔ شاہ جی کی علمی عظمت کا اظہار علماء کے ایک بڑے مجمع میں اس وقت ہوا جب ہمارے آبائی شہر بھیرہ کی شیر شاہی مسجد کے متولی کے حوالہ سے اختلاف پیدا ہوا، مجلس حزب الانصار کے بانی مولانا ظہور احمد بگوی اور ان کے برادر بزرگ مولانا محمد یحیٰ کے درمیان مسئلہ متنازعہ تھا۔ مولانا ظہور احمد نے اپنا ثالث شاہ جی کو تجویز کیا تو مولانا محمد یحیٰ نے معروف چشتی خانقاہ سیال شریف کے سجادہ نشین خواجہ قمر الدین کو...... خواجہ قمر الدین اس وقت کے سجادہ نشینان پنجاب میں سب سے بڑے عالم تھے۔ جنہیں سلسلہ خیر آباد کے بزرگ عالم مولانا معین الدین اجمیری کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ویسے خواجہ صاحب اپنی علمی سند کے حوالہ سے بڑے فخر سے فرماتے کہ میری سند میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کا اسم گرامی ہے جنہوں نے پیغمبر اسلام کی تعریف میں وہ نکات بیان کئے کہ مولانا کے بڑے بڑے نکتہ چینوں کی فکر ان کے گرد راہ کو نہیں پہنچ سکتی۔

میرے والد گرامی مولانا محمد رمضان علوی کے بقول اس نزاع کے فیصلہ کے لئے سرگودھا شہر کی جامع مسجد میں اجلاس ہوا۔ ضلع شاہ پور (اب سرگودھا) کے علاوہ دوسرے مقامات کے جید علماء اور فریقین کے ہمدرد بڑی تعداد میں موجود تھے۔ مسئلہ اس قسم کا تھا کہ فقہی سرمایہ پر گہرا عبور رکھنے والا شخص ہی اس پل کو عبور کر سکتا تھا۔ جبکہ شاہ جی کے متعلق ایک فقید المثال خطیب کی شہرت تھی لیکن مولانا ظہور احمد بگوی جیسے ذہین شخص نے اپنے شیخ طریقت مولانا احمد خان نقشبندی مجددی کے اشارہ سے شاہ جی کا جو انتخاب کیا تھا وہ بلاوجہ نہ تھا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی ایک بہت پختہ کار اور جید عالم تھے۔ لیکن یہ بات تاریخ میں محفوظ ہے کہ شاہ جی نے کتب فقہ و فتاویٰ کی روشنی میں اپنے مؤکل کا مقدمہ اتنی خوبصورتی سے لڑا کہ فیصلہ مولانا ظہور احمد کے حق میں ہوا اور پھر مولانا ظہور احمد اپنی ساری زندگی شیر شاہی مسجد بھیرہ کے متولی اور خطیب رہے۔ چونکہ وہ خود اولاد سے محروم تھے۔ اس لئے ان کے بعد ان کے برادر بزرگ مولانا نصیر الدین کے فرزند مولانا افتخار احمد جانشین ہوئے اور اب ان کے فرزند برادر عزیز ابرار احمد بگوی اس منصب پر فائز ہیں۔ اس فیصلہ کے نتیجہ میں شاہ جی کی علمی دھاک بیٹھ گئی اور بالخصوص شمالی پنجاب میں اس فیصلہ اور شاہ جی کے علمی دلائل کا زبردست چرچا ہوا۔

شاہ جی کے حوالہ سے اور ان کی علمی عظمت کے حوالہ سے ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ایک دنیا جانتی ہے کہ انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ جلسہ ۱۹۳۰ء میں انہیں امیر شریعت تجویز کیا گیا اور اس موقع پر پانصد علماء نے ان کی بیعت کی۔ اس تجویز کو پروان چڑھانے والے علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری تھے۔ جو علامہ اقبال کے علمی مرشد، دور آخر کے محدث جلیل اور فقید النفس بزرگ تھے، دہلی کے بزرگ عالم مولانا احمد سعید نے علامہ انور شاہ کی وفات پر کہا تھا کہ ہم نے ایک لائبریری دفنا دی۔ خانقاہ گولڑہ کے فیض یافتہ اور جامعہ عباسیہ بہاولپور کے علمی سربراہ مولانا غلام محمد نے انور شاہ کے آخری سفر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موقعہ پر جب وہ شدید بیمار بھی تھے۔ اسّی سے زیادہ انتہائی مشکل سوالات مولانا انور شاہ کے سامنے رکھے۔ مولانا نے ایک ایک سوال کا جواب کتابوں کے صفحات اور سطور کی قید کے ساتھ لکھوا دیا۔ جس پر مولانا غلام محمد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور کہنے لگے کہ آپ کے بعد ہم جیسے لوگوں کی علمی پیاس کون بجھائے گا۔ اسی عظیم عالم انور شاہ نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی امیر شریعت کی تجویز پیش کر کے خود ہی سب سے پہلے بیعت کی۔ اس منصب و اعزاز کا مقصد کیا تھا۔ اس کے لئے قارئین کے سامنے ایک حوالہ لانا ضروری ہے۔ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت کی پہلی جلد میں ضمیمہ جات کے حصہ میں دوسرا ضمیمہ صفحہ ۴۶۷ سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "مسودہ فرائض و اختیارات امیر الشریعت فی الھند" ہے۔ یہ مسودہ ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مرتب ہوا۔ اسے ترتیب دینے والے مولانا کفایت اللہ، مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا محمد سجاد بہاری جیسے صاحب نظر علماء تھے۔ بعد میں سید سلیمان ندوی، حکیم اجمل خان جیسے حضرات بھی شامل کئے گئے۔ بیس جید علماء اور ذمہ دار زعما پر مشتمل اس کمیٹی نے جو مسودہ تیار کیا وہ متحدہ ہندوستان کی مسلمان قوم کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان قوم کی تنظیم، اس کے دینی، ملی، روحانی، علمی، مالی اور عدالتی مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کا نظم بنایا جائے تاکہ مسلمان قوم انگریزی قوانین کی دلدل سے نکل سکے، اس نظام کی تجویز و تحریک کے سلسلہ میں ابتدائی مشورے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سجاد بہاری کے تھے۔ مولانا ابوالکلام کی جیل کی وجہ سے مولانا سجاد نے ساری ذمہ داری اپنے سر لی اور یہ حیرت زا معاملہ ہے کہ انہیں کے صوبہ بہار میں یہ نظام بڑی کامیابی سے سب سے پہلے چلا اور پھر دھیرے دھیرے ہندوستان کے مختلف خطوں میں پھیلتا گیا اور تقسیم کے بعد بھی ہندوستان کے بڑے حصہ میں، یہ نظام کامیابی سے چل رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مسلمان بہت سے عدالتی جھگڑوں اور پیچیدگیوں سے بچ کر اپنا وقت و سرمایہ بچا رہے ہیں۔ یہ ساری کاوش جمیعتہ علماء ہند کے تحت ہوئی۔ علامہ انور شاہ اس نظام کا اہم حصہ تھے۔ پنجاب میں اسی نظام کی خاطر امیر شریعت کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا انتخاب ہوا لیکن ہمیں یہ اعتراف ہے کہ اس بد نصیب خطہ میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں برپا نہ ہو سکا۔ لکھنو کے معروف عالم مولانا محمد منظور نعمانی کے فرزند مولانا عتیق الرحمن نے چند ماہ قبل لندن سے ایک خط میں ان سطور کے راقم کو بطور خاص لکھا کہ پنجاب میں اس نظام کا کیا بنا؟ اور جمیعتہ علماء کی نگرانی میں ملک کے بڑے حصہ میں جو نظام کامیابی سے چلا پنجاب میں اس پر کیا گزری؟ میں مولانا عتیق الرحمن کو کیا بتاؤں کہ اس کا سبب کیا ہوا اور پنجاب میں اس نظام پر کیا گزری؟ سب سے پہلا مسئلہ تو خود سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا تھا جو اللہ تعالی کی طرف سے فقر غیور لے کر پیدا ہوئے، انہیں قدرت نے بے پناہ علم، جوش عمل، خطابت، معاملہ فہمی اور سب سے بڑھ کر بے گراں دولت اخلاص سے نوازا تھا۔ میری عقیدت مندانہ نہیں دیانتدارانہ رائے ہے کہ وہ قافلۂ صحابہ کی بچھڑی ہوئی شخصیت تھے۔ انہیں قدرت نے لحن حجازی ہی نہیں دل و دماغ بھی حجازی عطاء فرمائے تھے۔ وہ "حادثاتی سید" نہ تھے بلکہ فی الواقع حسنی سادات کے گل سرسبد تھے ان کو اللہ تعالی نے جن خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا ان کے پیش نظر وہ بہت سے طبقات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بشمول طبقۂ اہل علم کی نظر میں محسود تھے۔ لوگ ان کے علم، جوش عمل، اور جذبۂ اخلاص کا مقابلہ نہ کر سکتے تو حسد کے مکروہ ہتھیاروں سے کام لیتے، سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ہر مسجد، ہر مدرسے ہر ادارہ اور اس کے منتظم کی عزت کو اپنی عزت سمجھا۔ ان اداروں کی آب یاری کے لئے جھولی پھیلا کر ملت سے بھیک مانگی اور وقت آنے پر اداروں کی ناموس کے لئے خود اور اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کو اس طرح کھڑا کیا کہ کوئی میلی نظر نہ اٹھ سکی۔ لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اس مرد غیور کے جذبات کی قدر نہ کی گئی، بقول شاہ جی "میں محسود علماء تھا" علامہ انور شاہ جیسی شخصیت نے جب اپنا ہاتھ بڑھا کر بیعت کی تو ان کے سامنے دم مارنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ پانصد بیعت کرنے والوں میں ہندوستان کے ہر خطہ کے لوگ تھے۔ پنجاب کے جو حضرات اس موقعہ پر شریک بیعت تھے۔ مثلاً مولانا احمد علی لاہوری جیسے حضرات، انہوں نے آخر وقت تک عہد وفا کو نبھایا لیکن انگریزی سطوت کی خاطر جعلی نبی، جعلی ولی اور اس ظالم سامراج کے تحفظ کے لئے فوجی جوان چننے والے خطہ کے اہل علم کی بڑی اکثریت نے اس مرد وفاشعار سے اپنے آپ کو دور رکھا، خطرہ یہ تھا کہ اس کے قرب کی وجہ سے کہیں انگریزی جیل کی ہوا نہ کھانی پڑے۔ ایسے ایسے المناک واقعات رونما ہوئے کہ بعض خطوں اور علاقوں کے اہل علم نے اپنے یہاں مہمان بنا کر ان کی سرگرمیوں سے خفیہ محکموں کو اطلاع دے کر نوازشیں حاصل کیں تو بعض مقامات کے یاران طریقت نے علاقہ کے جاگیرداروں اور وڈیروں کا اعتماد حاصل کر کے شاہ جی کے وعظ کے لئے مساجد ومدارس کے دروازے بند کر دیئے تو شاہ جی کے جی دار کارکنوں نے سکھوں اور ہندوؤں کے مذہبی مقامات پر ان کی تقریریں کرائیں۔ یوں صحیح معنوں میں بت کدے میں اذان کی بات سامنے آئی۔ ان حالات میں امارت شرعیہ کا نظام کیسے چل سکتا تھا؟ لہذا شاہ جی نے اپنی تمام سرگرمیوں کا رخ باطل قوتوں خصوصاً قادیانیت کے محاذ کی طرف موڑ دیا۔ کہ اگر حسد ورقابت اور بغض و کینہ کے ماحول میں امارتِ شرعیہ کا نظام نہیں چل سکا تو کم از کم تبلیغ و تحریک کے ذریعہ اقامتِ دین کا ماحول تو پیدا کر دیا جائے۔ بہر حال یہ بڑی تلخ داستاں ہے اور مجھے یقین ہے کہ جو لوگ "امارت شرعیہ" کے نظام سے واقف ہیں اور پنجاب میں اس نظام کی ناکامی کا سوال ان کے ذہن میں ہے وہ ان اشارات سے بہت کچھ سمجھ گئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہنا ضروری ہے کہ چونکہ پنجاب پر جعلی نبوت کا سایہ منحوس پڑ چکا تھا۔ اس لئے شاہ جی نے اپنے مرشد علمی مولانا انور شاہ کے حکم سے اپنی سرگرمیاں اسی پر مرکوز کر دیں۔ مولانا انور شاہ ہی تھے جن کی توجہ سے علامہ اقبال نے زندگی کے آخری ایام میں بالکل اچھوتے انداز سے قادیانیت کا تجزیہ کیا، مرحوم کے فرزند جاوید میاں خواہ کچھ کہیں، اقبال کی زندگی کی یہ وہ نیکی ہے جسے اس کی سوانح سے کھرچا نہیں جا سکتا۔

□□

© rasailojaraid.com